Woodbrooke Series.

THE PLACE OF REASON IN RELIGION.

By Prof. Lootfy Levonian.

مذہب میں عقل کا درجہ

مصنفہ

پروفیسر لُطفی لیوونیان صاحب

مقیم بیروت

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی - لاہور

The Punjab Religious Book Society,

Anarkali, Lahore.

Woodbrooke Series.

THE PLACE OF REASON IN RELIGION.

مذہب میں عقل کا درجہ

آزادی ہی وہ خصوصیّت ہے جو ہمارے زمانہ اور زمانہ گذشتہ
کے درمیان فرق ظاہر کرتی ہے۔ ہر فرد بشر آزادی خیالات اور آزادانہ
زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہے۔ آج جمہوریت گورنمنٹ کی پالیسی ہے۔
معاشرتی زندگی میں مرد و زن کے مساوی حقوق۔ مدارس کے نظم و نسق
میں اُستاد اور شاگرد کا دوستانہ اتحاد یہ تمام ایسی تحریکیں ہیں جو آزادی
کے خیال کو پسند کرتیں اور اُس کی تائید کرتی ہیں۔ مزدور پیشہ لوگوں کے
درمیان بھی آجکل مزدوروں کو غلام کی مانند تصوّر نہیں کیا جاتا بلکہ اُنہیں
بھی آزادی حاصل ہے۔ بعض بعض انتظامات میں ملازمین نہ صرف نظم و
نسق بلکہ نفع میں بھی اپنے مالکوں کے ساتھ حصّہ دار ہوتے ہیں۔ یہ خیال
خاندانی زندگی پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ زمانہ سلف میں شوہر و بیوی اور باپ
اور بیٹے کے باہمی تعلقات میں کسی قدر ظُلم کا عنصر شامل تھا۔ لیکن دورِ
حاضرہ میں شوہر اپنی بیوی کو اپنا رفیق حیات سمجھتا ہے اور باپ اپنے
کم سن لڑکوں کو بمنزلہ بالغ تصوّر کرتا ہے۔ قصّہ کوتاہ آجکل زندگی کے ہر صیغہ

میں لوگ جبر وجفا کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ وہ آزادی خیالات کے خواہاں ہیں اور یہ خواہش قدرتی ہے۔ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ انسان کی ذات اور اُس کی شخصیت کو نشو ونمادی جائے۔ اور یہ فقط آزادانہ ماحول کے درمیان ممکن ہو سکتا ہے شخصیت ظلم وستم کے ماتحت ترقی نہیں کر سکتی۔

اب اس آزادی کی تحریک میں مذہب کی کیا جگہ ہوگی؟ مذہب کے متعلق بحث کرنے میں یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اگر مذہب کوئی ایسی چیز ہے جس کی ہم کو کورانہ تقلید کرنی ہے اور بلا حیل وحجت اُسے قبول کرنا ہے تو وہ اس آزادی کی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بعض لوگ جن کا خیال مذہب کے متعلق یہی ہے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ چونکہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے والدین نے ہم کو بچپن میں سکھائی ہے اس لئے سن بلوغ کو پہنچ کر جب ہمارا دماغ خوب ترقی کر چکتا ہے اُسے برطرف کر دینا چاہئے۔ یہ استدلال کُلیتہً صحیح نہیں کیونکہ ہم اپنی زندگی میں اوروں سے بہت سی باتیں سیکھتے ہیں۔ نوزاد بچہ کی زندگی کا آغاز جاہلیت سے ہی ہوتا ہے لیکن وہ ابتدا میں ہی اپنے والدین سے بہت سی نئی باتیں سیکھتا ہے۔ وہ اُن کی نقل کرتا ہے اور جو کچھ وہ اُس کو بتاتے ہیں اس کو قبول کر لیتا ہے۔ ہم اپنی زبان بھی اپنے والدین سے ہی سیکھتے ہیں۔ جب بچہ قدرے بڑا ہوتا ہے تو وہ مدرسہ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے اُستادوں اور اپنی کتب درسی سے اور بہت سی باتیں سیکھتا ہے۔ نہ صرف وہ دُنیا اور زندگی بلکہ پہاڑوں۔ وادیوں۔ پھولوں اور جانوروں وغیرہ کے متعلق علم

حاصل کرتا ہے۔ اِسی طرح وہ قدرتی طور پر مذہب کے متعلق بھی سیکھتا رہتا ہے۔ بعینہٖ جیسے ہم اخلاق۔ حق اور مختلف علوم کے بارے میں پہلے اپنے والدین۔ اُستادوں اور اوروں سے سیکھتے ہیں اسی طرح ہم مذہب کا مفہوم بھی اُن کے افعال اور اُن کے اقوال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ مذہب کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہم ان لوگوں کی نسل ہیں جو ہزارہا سال ہم سے پیشتر ہو گذرے ہیں اور جو کچھ ہم اپنے عالمِ طفولیت میں سیکھتے ہیں وہ وہی ہے جو اُنہوں نے دریافت کیا معلوم کیا اور سیکھا تھا۔ برعکس اس کے جو کوئی بچہ اپنے والدین اور اپنے اُستادوں سے کچھ نہیں سیکھتا وہ ہمیشہ جاہل کا جاہل ہی رہ جاتا ہے اور اُس کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ گذشتہ باتیں ہماری میراث ہیں جن کو ہم ورثہ میں پاتے ہیں۔ جس طرح اخلاق۔ علوم اور صداقت ہمارے حصہ میں آتے ہیں اُسی طرح مذہب کا بھی حال ہے جو کچھ ہم کو میراث کے طور پر ملتا ہے ہم اس کو قبول کرتے ہیں اور اُسی سے شروع کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر ایک صیغہ میں ہم ہمیشہ اُس جگہ سے شروع کرتے ہیں جہاں زمانہ گذشتہ نے ہم کو پہنچایا ہے ترقی فقط اسی طریق پر ممکن ہے۔

مذہب کے خلاف اس دلیل میں ایک اور نکتہ ہے جو بالکل صحیح اور سچ ہے حصول علم کے متعلق یہ بالکل درست ہے کہ ہم وہ سیکھنا شروع کرتے ہیں جو اور ہم کو سکھاتے ہیں۔ لیکن ہم اس کو کافی نہیں سمجھتے۔ آخر کار ہم کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ ہم اُن باتوں کی حقیقت کو جو ہم کو سکھائی گئی ہیں کامل طور پر دریافت کریں۔ اور ہم پہلے خود اُن باتوں کا معائنہ کرتے ہیں جو ہم نے اوروں سے سیکھی ہیں۔ صحیح علم حاصل

کرنے کا طریقہ یہی ہے ہم اگر اس کو جو ہم نے اپنے اُستادوں۔ اپنی کتابوں اور
اَوروں سے سیکھا ہے کافی تصوّر کرلیں تو ہمارا علم درحقیقت ہمارا علم
نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ ہم نے بہت سی باتیں ازبر کرلی ہوں اس
وقت ہمارا علم طوطے کا سا علم ہوتا ہے۔ آج ہم ایک بات ایک طریق
سُنتے ہیں اور ویسے ہی بولتے ہیں شاید کل ہم اس کو دوسرے طریق پر
سُنیں پھر ہم اس کو ویسے ہی دُہراتے ہیں۔ وہ طالب العلم جو حقیقی معنوں
میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ بذاتِ خود جُستجُو اور
تحقیق کرے اور اس کا ذہن آزاد اور حصولِ علم کے لئے ہر وقت کُھلا
رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ علم لوگوں کو ایسی آزادی بخشتا ہے جس
کے باعث وہ ہر قسم کی دریافت و تفتیش کرسکتے ہیں۔

اس موقع پر مذہب اکثر قاصر رہتا ہے۔ مذہب کی فضیلت کو محفوظ
رکھنے کے لئے ادیانِ مذہب نے مذہبی اعتقادات کا درجہ انسانی عقل سے
بلند تر رکھا ہے اور بنی نوع انسان کو دعوت دی ہے کہ اُنہیں کامل
ایمان کے ساتھ قبول کریں۔ بعض اوقات اُنہوں نے ایسا کرنے میں ظلم و
تعدّی سے بھی کام لیا ہے۔ اِسی وجہ سے مذہب اُن لوگوں کو جو آزادی
خیالات کے دلدادہ تھے ایک قسم کی قید یا بندش معلوم ہوا اور جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے خلاف مخالفت کے دریا بہہ نکلے۔ اگر مذہب لوگوں
کا منظورِ نظر بننا چاہتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانا چاہتا ہے تو اُسے
اپنے تحکمانہ انداز کو خیرباد کہنا پڑیگا۔ اگر ایک نوجوان کو جس نے مدرسہ
میں آزادئ خیالات کی تعلیم پائی ہو گرجہ یا مسجد کے ماتحت بہ جبر رکھا جائے
تو وہ مذہب سے باغی ہوجائیگا۔ کیا تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فقط اُن

ہی ممالک میں مذہب کی مخالفت کے دریا موجزن ہوئے ہیں جہاں مذہب
کی تعلیم ظلم وستم کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ چاہئے کہ مذہب لوگوں کو آزادی
خیالات کی اجازت دے۔ ہم سائنس اور دیگر علوم کی اُن حقیقتوں کو جن
کو ہم نے اپنی صغیر سنی میں سیکھا ہے سن بلوغ کو پہنچ کر کافی خیال نہیں
کرتے۔ ہم نئی ایجادات سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے دماغوں کو
نئی چیزوں کے لئے ہر وقت کُھلا رکھتے ہیں۔ پس چاہئے کہ اسی طرح ہم
مذہب کے معاملہ میں بھی کریں۔ چاہئے کہ ہم مذہبی عقاید کے متعلق بھی
اپنے آپ کو ان باتوں کا پابند نہ بنائیں جو ہزارہا سال ہوئے سکھائی گئیں۔
بلکہ چاہئے کہ ہم نئے خیالات سے فائدہ اُٹھائیں۔ چاہئے کہ ہم اس بات
کو اپنا فرض سمجھیں کہ اپنے دل و دماغ کو نئی باتوں کے لئے کھولیں لیکن ساتھ
ہی اس کے گذشتہ باتوں کی تعظیم و تکریم لائق طور سے کریں۔ ہمارا مقصد
یہ ہونا چاہئے کہ حق کو دریافت کریں نہ یہ کہ مروجہ اعتقادات کی حمایت کریں۔
چاہئے کہ مذہب ہمیشہ ہم کو اس بات کے لئے آزاد رہنے دے کہ ہم حق
کو قبول کرسکیں خواہ وہ ہم کو کسی وقت یا کسی مقام میں ملے۔

اب یہ سوال ہمارے سامنے پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہبی عقائد کی آزادی
مذہبی بُنیاد سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں؟ اگر مذہب سچا ہے تو پھر کس
طرح وہ شخصی آزادی کے ہمدوش رہ سکتا ہے؟ چونکہ مذہب کا واسطہ فوق الفطرت
حقیقتوں کے ساتھ ہوتا ہے اور انسانی عقل کی رسائی فقط قدرتی اشیا تک
محدود ہوتی ہے تو پھر انسان کو کیونکر مذہبی اعتقادات کی دریافت میں
آزادی کی اجازت ہوسکتی ہے۔ کیا مذہبی اعتقاد اور شخصی آزادی باہم ملائے
جاسکتے ہیں؟ زمانہ حاضرہ میں مذہب کے متعلق یہ سب سے اہم سوال ہے

جو پوچھا جاتا ہے۔

آیئے ہم سب سے پیشتر شخصی آزادی کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم آزادی خیالات آزادی ایمان اور آزاد زندگی سے کیا سمجھتے ہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی کا مطلب حسب منشا زندگی بسر کرنا اور اپنی طبیعت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اکثر لوگ اسی کو آزادی خیال کرتے ہیں اور اسی طرح رہتے اور زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر آزادی کا مطلب یہی ہے تو وہ قدرتاً مذہب اور ہر قانون کے خلاف ہے۔ لیکن آزادی کا یہ مفہوم نہایت دقیانوسی اور خام ہے۔ ہمارا خیال غلط نہ ہوگا اگر ہم کہیں کہ آزادی کا ایسا تصور صرف حیوان ہی کر سکتے ہیں۔ اکثر وحشی اقوام اسی کو آزادی مانتی ہیں حالانکہ اصل آزادی اور اس میں فرق ہے اگر حقیقی آزادی یہی ہوتی تو سب سے زیادہ ترقی کرنے والی اقوام وحشیوں کے درمیان ہی ہوتیں۔

حقیقی آزادی کیا ہے؟ انسانی شخصیت کے چند ایک اصول ہیں اور ہماری شخصیت انہی اصولوں پر قائم ہے۔ ان اصولوں کی شناخت اور ان کے مطابق عمل کرنے سے حقیقی آزادی کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ مثلاً انسان کو عقل بخشی گئی ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور اس کو نہ ماننا آزادی نہیں بلکہ بیوقوفی ہے۔ پھر انسان میں اخلاقی اصول بھی موجود ہے یعنی صداقت۔ عدل۔ راستی اور نیکی کے جذبات جو ہم میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا احترام کرنا انسان کا فطرتی اور طبعی خاصہ ہے۔ وہ شخص جو اس قاعدہ کو نہیں مانتا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں ضرور نقصان اٹھاتا ہو۔ یہ اصول ایسے نہیں جو باہر سے لا کر جبراً ہماری ذات میں شامل کئے جاتے ہیں بلکہ وہ ہماری ذات اور ہماری شخصیت کا اصل اصول

ہیں۔ بعینہٖ جس طرح یہ قانون قدرت ہے کہ مچھلی پانی میں ہی زندہ رہ سکتی ہے اور پرندے ہوا میں اسی طرح یہ بھی انسانی فطرت کے مطابق ضروری اور لازم ہے کہ انسان عقل اور تمیز کے اصولوں کے مطابق عمل کرے۔ لہٰذا آزادی کے معنی یہ نہیں کہ انسان عقل و تمیز کے اصول کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذرانے بلکہ برعکس اس کے ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا جو ہماری زندگی کے اصل اصول ہیں آزادی ہے۔ ہر ایک شئے جو عقل اور تمیز سے مطابقت رکھتی ہے آزادی ہے اور ہر ایک چیز جو عقل و تمیز کے خلاف ہے غلامی ہے۔

اب وہ سوال جو ہمارے درپیش ہے یہ ہے کہ آیا مذہب عقل و تمیز کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا ان کے خلاف ہے۔ اس کا جواب ہمارے مفہوم مذہب پر منحصر ہوگا۔ اگر مذہب ایک ایسے خدا پر ایمان لانا ہے جو اپنے اقوال و افعال کا ذمہ وار نہیں اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ کورانہ وار بعض احکام کی تعمیل کی جائے جو اس نے بعض لوگوں کو پوشیدہ طور سے دیئے ہوں تو پھر مذہب ایک باطل اعتقاد اور زہد و تقوٰی غلامی بن جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک مذہب کا یہی مفہوم ہے اور بعض اوقات وہ ایسے عقیدے دُہراتے رہتے ہیں جن کا مطلب وہ خود بھی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ مذہب ایسا نہیں۔ مذہب ذاتی و شخصی ایمان اور سمجھ کا سوال ہے۔ خدا کوئی جبار و قہار نہیں۔ خدا ہم سے ایسا سلوک نہیں کرتا۔ مذہب کا مقصد راستی اور سچائی ہے۔ اس کے صحیح معنی حقیقی انسانیت ہے۔ حقیقی انسانیت جبراً نہیں دی جاتی کیونکہ اس طور سے فقط غلام اور کور باطن مذہبی دیوانے ہی نشو و نما پاتے ہیں۔

مذہب کا افضل اور اعلیٰ ترین مفہوم خدا اور انسان کی باہمی رفاقت اور اشتراکِ عمل ہے۔ رفاقت اور اشتراکِ عمل جبراً ممکن نہیں۔ خدا ہم کو ترغیب دینے کا طریقہ اپنی مرضی کے مطابق خود نکالتا ہے۔ اگر خدا مردم آزار ہوتا اور وہ ہم سے ظالمانہ سلوک کرتا تو ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار نہ ہوتے۔ خدا کا سلوک ہمارے ساتھ وہی ہے جو باپ کا اپنے بچے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مردم آزار ستمگر اپنے غلاموں کو حکم دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اُس کے احکام کی تعمیل فوراً اور بے چون وچرا کی جائے خواہ وہ ان کی مرضی کے موافق ہو یا نہ ہو۔ آج کل بھی ایسے باپ موجود ہیں جو اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح پیش آتے ہیں لیکن اس سے بچہ کی شخصیت مُردہ ہو جاتی ہے۔ کامل انسان اس طور سے نشوونما نہیں پا سکتا۔ جو شخص حقیقی معانی میں باپ کے نام کا مستحق ہے وہ اپنے بچے کی شخصیت کا قائل ہوتا ہے اور ظلم و تعدی کے بجائے استقلال سے اپنے بچے کو سکھاتا اور اُسے قائل کرتا ہے۔

مذہب میں بھی خدا کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ خدا عقل و تمیز کا مُبدا ہے اور اُس کے احکام و قوانین عقل و تمیز کے مطابق ہیں۔ خدا ہمیں یہ دعوت نہیں دیتا کہ ہم آگر بعید الفہم مسائل پر ایمان لائیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم ہر ایک بات کو اپنی عقل و تمیز کے ذریعہ سے معلوم کریں۔ حق سے محبت رکھنی اور حق کے مطابق زندگی بسر کرنی ایک ایسا اُصول ہے جو تمام بنی نوع انسان پر حاوی ہے اور خدا بھی ہم سے یہی چاہتا ہے۔ حق اور عدل اور انصاف کو ملحوظ رکھنے میں ہمارے اور ہمارے ہمسایوں کے باہمی تعلقات ہیں۔ ان کے ذریعہ سے محبت اور دوستی کے جذبات ترقی پاتے ہیں اور دشمنی اور انتقام کے جذبات کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ یہی حقیقی انسانیت کے اُصول ہیں

اور خدا ہم سے یہی طلب کرتا ہے اور یہی برحق اور سچا مذہب اور حقیقی زہد و تقویٰ ہے۔ مذہب کے مختلف تصورات میں سے سب سے زیادہ پاکیزہ یہی تصور ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو عقل و تمیز کے خلاف ہو۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ مذہب نے اس سادہ صورت کو چھوڑ کر نہایت بے ترتیب اور مخفی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور اس وجہ سے مذہب کے متعلق بحث کرنے میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ مذہبی زندگی کو اسی سادہ صورت میں رکھتے انسان نے اُسے ایک ایسی صورت میں ڈھالا ہے جو انسانی عقل و ادراک کے مطابق نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار مذہب آزادی کے بجائے غلامی۔ ترقی کے بجائے ظلم۔ محبت کے بجائے نفرت بن گیا اور اکثر اوقات متدین لوگ مذہبی دیوانے ہو گئے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہم خداوند یسوع مسیح کے زمانہ میں پاتے ہیں۔

اُن دنوں میں اہلِ یہود کا یہ اعتقاد تھا کہ خدا حاکمِ مطلق ہے اور اُن کی شریعت ایسی ہے جس کو بلا حیل و حجت ماننا اُن کا فرض ہے۔ تورات میں اس حاکمِ مطلق کے ناقابلِ بحث احکام مرقوم تھے۔ اور وہ کھانے پینے، شغلِ زندگی۔ عبادت اور دستوروں کے قواعد و قوانین کے متعلق برتر اور اعلیٰ بلکہ اختیارِ مطلق تصور کئے جاتے تھے۔ یہودی کی تمام زندگی تورات پر منحصر تھی۔ تورات زندگی کے کل صیغہ جات پر قابض تھی۔ ہر ایک حالت میں یہودی کا یہ فرض تھا کہ اس کے ایک ایک نقطہ کو کامل طور سے مانے۔ تورات باقی تمام شریعتوں اور فہم و ادراک سے افضل خیال کی جاتی تھی۔ اور کسی شخص کو یہ اجازت نہ تھی کہ اُس کے احکام اور اُس کے قواعد و قوانین کے متعلق اپنی رائے

کا اظہار کرے۔ بعض یہودی عالم شرع تورات کو خدا کے برابر سمجھتے تھے۔ اور اُن کا یہ یقین تھا کہ وہ خدا کی مانند غیر فانی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ یہودیوں کی عقل ترقی کرنے سے رہ گئی۔ زندگی ان کے لئے بوسیدہ اور کُہنہ ہو گئی اور مذہب نے غلامی کی صورت اختیار کر لی۔ یہودی مذہب کے مطابق آزادی خیالات کی ممانعت تھی۔

خداوند یسُوع مسیح کا ظہُور ایسے زمانہ میں ہؤا۔ جب یسُوع نے اُس باطل مذہب اور ریاکارانہ زندگی کو دیکھا جو ایسی شریعت کا لازمی نتیجہ تھی تو اُس نے اُس کی مخالفت کی۔ اور اُس نے تمام لوگوں کو یہ دعوت دی کہ وہ بجائے اس دیرینہ شریعت کے خود اپنی عقل اور اپنے فہم کی مدد سے آزادانہ غور و فکر کریں۔ یسُوع نے اُس تورات کی جس سے اہل یہود ڈرتے اور جس کی وہ بغیر چوں و چرا کئے پرستش کرتے تھے اپنی ذاتی رائے سے مخالفت کی یعنی اُس کی تعبیر نئے پیرائے میں کی اور بعض اوقات اس کی نُکتہ چینی بھی کی۔ یسُوع کی زندگی اور اُس کی تعلیم میں اس کی بیشمار مثالیں موجود ہیں۔

مثلاً مسئلہ یوم سبت۔ اہل یہود کی شریعت کے مطابق سبت کا روز اُن کے مذہب کے بُنیادی اصول سے تعلق رکھتا ہے اس کا پاک رکھنا اُن کی شریعت کا ایک ناقابل انکار حکم تھا یعنی اُس روز نہ تو کسی دُنیوی کام ہی کی اجازت تھی اور نہ ہی اُس روز وہ لوگ کسی اور قسم کے معاملہ میں پڑ سکتے تھے۔ تورات میں لکھا ہے "چھ دن تک تو محنت کر کے اپنے سارے کام کاج کر۔ لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے اُس میں کچھ کام نہ کر۔ نہ تو نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیری مواشی کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین دریا اور سب کچھ جو اُن میں

ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔" یہ امر قدرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کام کیا۔ تھک گیا اور پھر اُسے آرام کی ضرورت محسُوس ہوئی۔ لیکن کسی کو اس کے متعلق اعتراض کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چونکہ یہ تورات میں صاف اور واضح طور پر مندرج تھا لہٰذا بغیر اس کے متعلق سوال کئے اس کو قبول کرنا اور اس کی تقلید کرنی ہر ایک کیلئے لازم بلکہ فرض تھی۔

اس مسئلہ کو اس قدر اہم اور مہتم بالشان تصوّر کیا جاتا تھا کہ سبت کی عزت و توقیر کے ذریعہ سے ہی اُن لوگوں کے مذہب کا اندازہ لگایا جاتا تھا اور سبت کی بے حُرمتی کرنیکے لئے نہایت بھاری سزا مقرر تھی۔ مثلاً تورات کی چوتھی کتاب کے پندرھویں باب میں مندرجہ ذیل بیان پایا جاتا ہے۔ "بنی اسرائیل نے ایک شخص کو دیکھا جو سبت کے دن لکڑیاں جمع کرتا تھا۔ وہ اُسے پکڑ کے موسیٰ اور ساری جماعت کے پاس لے گئے اور اُنہوں نے اُسے قید میں ڈال دیا۔ تب خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ یہ شخص مار ڈالا جائے اور ساری جماعت خیمہ کے باہر اُس پر پتھراؤ کرے۔ چنانچہ ساری جماعت اُسے خیمہ گاہ کے باہر لے گئی اور اُسے سنگسار کیا کہ وہ مر گیا"۔ شاید یہ کوئی غریب شخص ہوگا جو اپنی روٹی پکانے کے لئے لکڑیاں جمع کرنے گیا ہو۔ لیکن اُنہوں نے اس کا خیال ہرگز نہ کیا۔ اُن کے لئے خدا کے حکم کی تعمیل واجب تھی۔ کسی میں اتنی جُرأت نہ ہوئی کہ یہ معلوم کرے کہ حقیقت میں خدا کا یہی حکم تھا یا نہیں۔ سبت کے متعلق ان کا قانون نہایت سخت تھا بلکہ اُس میں کسی قدر ظلم کی آمیزش بھی تھی اور یہ حکم یہودی مذہب کا سب سے قدیمی اور سب سے اہم ترین حکم تھا۔ یسُوع نے اس کی تعبیر از سرِ نو کرنی چاہی بلکہ اُسے اُس نے دُرست بھی کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اکثر

اوقات یہودی عالموں نے اُس کی سخت مخالفت کی۔

ایک مرتبہ موسمِ بہار میں جب یسُوع سبت کے دن اپنے شاگردوں کے ہمراہ کھیتوں میں سے گذر کر جا رہا تھا تو اُس کے شاگردوں نے گیہوں کی بالیں توڑیں اور اُنہیں کھانا شروع کیا۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ اس کے شاگرد مزے سے بالیں توڑتے اور اُنہیں کھاتے ہیں اور یسُوع نے بجائے اُنہیں منع کرنے کے اُنہیں اُن کے توڑنے اور کھانے کی اجازت دی ہے تو اُنہوں نے اُس سے کہا "دیکھ وہ سبت کے دن وہ کام کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہے۔" یسُوع نے نہایت اطمینان کے ساتھ اُنہیں یہ پُرمعنی جواب دیا "سبت انسان کے لئے بنایا گیا ہے نہ انسان سبت کے لئے۔" اس سے اُس کا یہ مطلب تھا کہ انسان سبت کا غلام نہیں۔ جو کچھ واجب اور دُرست ہے وہ سبت کے دن کر سکتا ہے۔ لیکن یہودی اس کی برداشت نہ کر سکے اُن کے خیال کے مطابق انسان کی عقل سبت پر قادر نہیں بلکہ سبت کو اُن کی عقل پر قدرت حاصل تھی۔ ایک مرتبہ ایک اور نہایت عجیب واقع وقوع میں آیا۔ یسُوع سبت کے دن ہیکل کے اندر موجود تھا۔ اُس نے وہاں ایک غریب محتاج شخص کو ایک کونے میں کھڑا دیکھا جس کا ہاتھ سُوکھ گیا تھا۔ یسوع کو اُس پر رحم آیا اور اُس نے اُسے بُلا کر بیچ میں کھڑا کیا۔ پہلے اُس نے اُس شخص کی طرف نگاہ کی پھر اپنے چوگرد جماعت پر نظر کی جو اُس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اور پہلے اُن سے یہ سوال پوچھکر کہ "آیا سبت کے دن نیکی کرنی روا ہے یا بدی؟" پھر اُس شخص کو شفا بخشی اور اُسے خوش و خرم روانہ کیا۔ یہودی اس پر سخت ناراض ہو گئے۔ ان کے خیال کے موجب ایک بیمار شخص کو شفا بخشنا بھی روا نہ تھا۔ لیکن یسُوع نے اپنی عقل اور اپنے

فہم کو استعمال کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ سبت کے دن نیکی کرنے سے بہتر اَور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا کو کیا پسند ہے۔ کاہل بیٹھے رہنا یا نیکی کرنا۔ یہودی اپنے خیالات میں عقل کو ہرگز استعمال نہ کرتے تھے وہ کورانہ وار فتوٰی لگاتے تھے۔

آیئے اب ذرا روزہ کے متعلق غور کریں۔ یہودی شریعت کے اعتبار سے روزہ ایک نہایت واجبی فرض تھا۔ ہر ایک یہودی کا فرض تھا کہ روزہ رکھے۔ لیکن یسُوع نے اپنے شاگردوں سے جبراً روزہ نہ رکھوایا اس نے انہیں اس امر میں کامل آزادی دی اور انہوں نے روزہ رکھنا ترک کر دیا۔ جب یہودی معلّموں نے یہ دیکھا تو وہ غصّہ سے بھر گئے اور یہ کہکر یسُوع سے اُن کی شکایت کی "تیرے شاگرد روزہ کیوں نہیں رکھتے"؟ یسوع نے پھر اُنہیں نہایت پُرمعنی اور مختصر سا جواب دیا اور کہا "کوئی آدمی پُرانی پوشاک میں نئے کپڑے کا پیوند نہیں لگاتا"۔ وہ اُنہیں یہ سکھانا چاہتا تھا کہ مذہب اور زندگی کے متعلق اُس کے خیالات نئے کپڑے کی مانند نئے خیالات تھے۔ پس وہ یہودی تورات کی پُرانی تعلیمات کے ساتھ پیوند نہیں کئے جا سکتے تھے۔ حقیقی مذہب روزہ رکھنے یا نہ روزہ رکھنے پر موقوف نہیں بلکہ وہ دل کی معصومیت اور رفتار و گفتار کی پاکیزگی پر منحصر ہے۔ ایک دفعہ اور یسُوع کے شاگرد اُس کے ساتھ بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانے بیٹھے۔ یہودیوں کے نزدیک ہاتھوں اور برتنوں کو صاف کئے بغیر کھانا شریعت کی رُو سے ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہودی معلّموں نے یسوع سے اُن کی شکایت کی۔ یسُوع نے پہلے اُنہیں یہ بتایا کہ صفائی کے متعلق قوانین منجانب اللہ نہیں بلکہ انسان کی اپنی روایات کا نتیجہ ہیں:

یسُوع اور یہودیوں کے درمیان جو عظیم فرق تھا وہ یسوع کے نئے قواعد اور قوانین کی وجہ سے نہ تھا بلکہ مذہبی اعتقادات کے مختلف معانی نکالنے کا نتیجہ تھا۔ یہودی مذہب کی رُو سے مذہب کے معنی کورِ باطنی کے ساتھ خدا کے ان احکام کی تعمیل تھا جو خدا نے گذشتہ زمانے میں اپنے بعض برگزیدہ خادموں کو دیئے تھے۔ یسوع اسے غلامی تصوّر کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ مذہبی زندگی اس کورِ غلامی کی قید سے آزاد ہو جائے۔ یسوع کا خیال مذہب کی نسبت یہ تھا کہ اس کے اصل اور حقیقی معانی آزادی ہیں۔ یہودی مذہب کے حقیقی معانی کے دریافت کرنے میں کبھی اپنی عقل کا استعمال نہ کرتا تھا۔ وہ جھوٹی قسم کھاتا اور پھر اپنی قسم کو پُورا نہ کرنے سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی حیلہ تلاش کرتا تھا۔ یسُوع اس کو بچوں کا کھیل خیال کرتا اور لوگوں کو یہ دعوت دیتا تھا کہ وہ شریعت کو اپنی عقل کے ذریعہ سے خُوب سمجھ لیں۔ یہودی دماغ روشنی سے متنفّر تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے ترقی نہ کی بلکہ برعکس اس کے وہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ بے شمار یہودی مذہب کو بوسیدہ اعتقادات کا طریقہ سمجھ کر لا مذہبی کی جانب مائل ہوگئے تھے۔ یسُوع نے مذہب اور عقلی بیداری اور ترقی کو باہم ملا دیا۔ کوئی شخص جو متدیّن ہے وہ کیوں عقل سے بے بہرہ ہو؟۔

کیا یہ ہمارے زمانہ کا اہم ترین مسئلہ نہیں؟ شخصی آزادی اور آزادیِ خیالات ہر ایک انسان کا ذاتی حق اور اُس کی بھاری میراث ہے۔ عقل و فہم خدا کی بخششوں میں سے سب سے افضل ہیں۔ درحقیقت حقیقی انسانیت اسی سے مرتب ہوتی ہے۔ اگر ہم آزادی

اُور اُس نے یوں کہا "تم سب میری سُنو اور سمجھو۔ کوئی چیز باہر سے آدمی میں داخل ہو کر اُسے ناپاک نہیں کر سکتی۔ مگر جو چیز آدمی میں سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے"۔ اگر ہم عقل سے سوچیں تو کیا فی الحقیقت یہ دُرست نہیں؟ کیا درحقیقت کوئی شخص پاک ہو سکتا ہے جو اپنے برتن اور اپنے ہاتھ صاف کر کے کھانا کھاتا ہے اگر اُس کے دل میں کینہ۔ بُغض اور عداوت موجود ہو؟

یسُوع کی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات وقوع میں آئے۔ یسُوع نے یہودی شریعت کی نئی تعبیر اور اُس کی نکتہ چینی کرنی چاہی۔ مثلاً نکاح قسم کھانے خُون کرنے۔ دروغگوئی۔ زناکاری۔ طلاق۔ قربانی۔ دُعا۔ عبادت۔ جزیہ اور خیرات سے متعلق یہودی شریعت اور اُن کی روایات کی نکتہ چینی۔ یسُوع کا یہ مقصد نہ تھا کہ خدا کے احکام کو رَدّ کرے بلکہ ان کے اصل معانی کو واضح کرے۔ شریعت میں یہ مرقوم تھا "تُو زنا نہ کر"۔ یہودی زنا کو گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے۔ لیکن اُن کے نزدیک یہ گناہ نہ تھا کہ شہوت کی نظر سے عورت پر نگاہ کریں اور انسان کے دل و دماغ میں شہوی خیالات نشوونما پائیں۔ یسُوع نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر اُنھیں یہ سکھایا کہ یہ بے معنی ہے۔ بلکہ اُنہیں یہ بتایا کہ جو کوئی عورت کی جانب اس خیال سے نظر کرتا ہے اُس نے اپنے دل میں اُس سے زنا کیا۔ اس کا یہ کلام کس قدر عمیق اور برحق ہے۔ لیکن تو بھی یہودی ان برحق اور سچے کلمات سے ناراض ہوئے۔ ایک الزام جو یہودی عالم شریعت یسُوع پر لگاتے تھے وہ یہ تھا کہ وہ موسیٰ کی شریعت کو خراب کرتا اور بگاڑتا تھا۔ جس حال کہ یسُوع فقط اپنی عقل کے ذریعہ سے شریعت کے حقیقی معانی سمجھانا چاہتا تھا۔ یسُوع لوگوں کو اس امر کی دعوت دیتا تھا کہ وہ شریعت کے قواعد و قوانین کو ہیچ جانیں بلکہ یہ کہ وہ اس کے صحیح معانی کو سمجھ کر اُس کے تابع رہیں۔

خیالات کو ہاتھ سے جانے دیں۔ اور عقل و سمجھ سے فیصلہ نہ کریں تو پھر انسانیت کا کیا باقی رہ گیا؟ آزادی انسانیت کی شرط ہے۔ اسے ہم کسی چیز پر نثار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مذہب ہمارے اطوار اور ہمارے اخلاق کی بُنیاد ہے۔ خدا اور مذہب کے بغیر ہمارے اخلاق ناقص ہو جاتے ہیں اور انسانیت گر جاتی ہے۔ کوئی فرد بشر اور کوئی جماعت مذہب اور اخلاق کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا مذہب اور اخلاق کو برطرف کر دینا محض جہالت ہے۔ ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم مذہبی اعتقادات کو بوسیدہ اور دیرینہ تعلیمات سے جُدا کریں اور اسی طرح خدا کے متعلق اپنے ایمان کو توہمات سے علیحدہ کریں۔ چاہیئے کہ ہم مذہب کو برباد نہ کریں بلکہ مذہب کو ایسی صورت میں رکھیں جو بنی نوع انسان کے حال کے مناسب ہو۔ اُس وقت مذہب اور عقل کے درمیان جُدائی نہ ہوگی۔ اس حالت میں مذہب انسانی ترقی کو تحریک دیگا۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم مذہب اور آزادی کے متعلق اپنے خیالات کو تبدیل کریں۔ مذہب ہماری شخصیت کا دُشمن نہیں بلکہ اُس کو کمال تک پہنچانے والا ہے۔ ایک بزرگ شخصیت فقط مذہبی ماحول کے درمیان نشو و نما پا سکتی ہے۔ نیک اور آزاد خدا کی نسبت ایمان ہی سب سے بڑی طاقت ہے جو انسان کے اخلاق کو زور بخشتی اور اُس کی روح کو پاکیزہ بناتی ہے۔ مذہب میں کوئی نقص نہیں بلکہ قصور ہماری اپنی عقل کا ہے جو مذہب کے صحیح معانی کو سمجھ نہیں سکتی۔

ایک بزرگ شخص نے اس سوال کا جواب کہ "کیا مذہب فائدہ مند

کا دوست ہے خواہ وہ کسی جگہ ہی کیوں نہ ہو اور اُس کی محبت ایسی بندرگاہ ہے جس میں داخل ہو کر زندگی کی تمام بدیوں اور بُرائیوں سے پناہ ملتی ہے۔ وہاں قلب انسانی کامل اور حقیقی مطابقت حاصل کر سکتا ہے اور وہاں انسانی روح زندگی کی کشمکش کے خلاف قائم رہ سکتی ہے۔ کیا اس سے بہتر اور کوئی مسرت بخش مژدہ ہو سکتا ہے؟